ڈاکٹر نجیب جمال
اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

میرؔ کی شاعری میں اعلیٰ انسانی اقدار کی نمود

It is a well known fact that Meer Taqi Meer was sole representative of Urdu Ghazal in eighteenth century. He portrayed the human feelings,experiences and historical disasters in his articulated poetry better than his contemporaries. The history of eighteenth century has been dipicted in his Ghazals with art and craft. Meer's poetry always quests for great human traditions with the narration of cheerfulness of love and deprived human beings. His great poetic art has made the adversities of life tolerable, bearable and endurable. Through this quality of his poetry he is still a source of inspiration for modern Urdu Ghazal.

اٹھارہویں صدی میں یوں تو شاعری کی تمام مقبول اصناف میں تخلیقات کے ڈھیر لگ گئے۔ قصیدہ، مثنوی، نظم، رباعی اور غزل میں طبع آزمائی ہوئی اور سودا، میر، درد، مصحفی، میر حسن، انشاء اور جرأت جیسے معروف شعراء سامنے آئے تاہم مجموعی طور پر یہ صدی اردو غزل اور میر تقی کے نام سے منسوب ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ میر کی شاعری کے انداز نے اردو شاعری کے مزاج اور لہجے کا تعین کیا اور اردو غزل کو پوری اردو شاعری کا قائم مقام بنایا۔ میرؔ کا لہجہ انسانی گفتگو کی نرمی، تہذیبی اقدار کی پاسداری اور دلّی کی تمدّنی شائستگی کی علامت تھا۔ اب یہ حالات کی ستم ظریفی تھی کہ پوری اٹھارہویں صدی میں دلّی خانماں برباد رہی خاص طور پر نادر شاہ درانی اور احمد شاہ ابدالی کے لشکروں کی یلغار (بالترتیب ۱۸۳۹۔۱۸۶۱) نے تو دلی شہر کو جو عالم میں انتخاب تھا خرابہ بنا کر رکھ دیا تھا، سراسیمگی کا یہ عالم تھا کہ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی ایسے میں نامرادانہ زیست اور محبت و مروّت کے قحط کے باوجود زبان و بیان میں شائستگی پرو کر ناکامیوں سے کام لینے کا سلیقہ اگر کسی کے یہاں تاثر اور رسائی رکھتا ہے تو وہ میر کی غزل ہے۔ میر کی شخصیت اور شاعری میں یکسانیت کی بہت سی صورتیں نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اپنی بے دماغی کو جس طرح سپردگی، معصومیت اور سادگی کا روپ دیا اور اس سادگی میں فن کی پرکاری کے ساتھ ساتھ رفاقت، انسان دوستی اور خوش معاملگی کو سمویا اس کی وجہ سے میرؔ کی شاعری انسانی صورتِ حال کی شاعری بن گئی ہے۔ خاص طور پر جس طرح پورے عہد کی شکست کا نظارہ میر نے اپنی ذات میں کیا تھا اس کی وجہ سے ان کی غزل انسانی وقار کی بحالی کی جدوجہد کرتی نظر آتی ہے ایک ایسے وقت میں جب عظیم انسانی اقدار پر یقین ختم ہوگیا تھا اور اس

عہد کی خانہ جنگیوں نے زندگی کی بے قدری، لایعنیت اور احساسِ مذلت کو راسخ کر دیا تھا، میر کی شاعری غم اور نشاط کی دونوں ناگزیر صورتوں کا بیان اور اعلیٰ انسانی اقدار کی جستجو کرتی ہے اور زندگی کو تمام ناکامیوں اور محرومیوں کے باوجود گوارا بنانے کی کاوش کرتی نظر آتی ہے۔ یہی میر کی غزل کی وہ آفاقی سچائی ہے جو کسی نہ کسی صورت میں آج بھی جدید غزل کو میر کی دین ہے۔

میر کا مقام شاعری ہی میں نہیں زبان کے ارتقاء میں بھی ممتاز ہے۔ میر نے نہ صرف اردو زبان میں رچاؤ، گھلاوٹ اور لطافت پیدا کر کے اس وقت تک کے اسالیب اور لہجوں میں رس پیدا کیا بلکہ مستقبل کی غزل کا مزاج اور تغزل کا پرسوز مگر شیریں آہنگ بھی متعین کر دیا۔

آزاد نے ''آبِ حیات'' میں بالکل صحیح لکھا ہے:

''قدردانی نے ان کے کلام کو جواہر اور موتیوں کی نگاہ سے دیکھا اور نام کو پھولوں کی مہک بنا کر اُڑا دیا۔''[1]

میر کے اشعار ہر دَور میں لوگوں کی زبان پر رہے ہیں۔ یہ اشعار مختلف انسانی کیفیتوں کے ترجمان ہیں اس لیے سفرِ زندگی کے سخت مقامات میں تسلی کا باعث بنتے رہے ہیں اور اہلِ دل کے درمیان سوغات کی طرح تقسیم ہوتے رہے ہیں۔

میر نے غزل کو بے پناہ وسعت دی۔ ''ہر بڑے شاعر کی طرح میر کی شاعری بھی معنی کی کثرت کا تاثر قائم کرتی ہے۔''[2] انسان کی داخلی دنیا میں جتنی گہرائی اور گیرائی ہے جتنی رنگینیاں اور رعنائیاں، معصومیت اور پُراسراریت ہے۔ میر کی غزلوں میں ان سب کے مختلف اور متنوع پہلو دکھائی دیتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ احساسِ الم کے شاعر ہیں مگر ان کی شاعری غموں اور دکھوں کے حظ اور نشاط کشید کرتی ہے۔

میر کی غزل کے آئینے میں ان کا عہد منعکس ہوا ہے۔ ان کی شاعری پر اٹھارہویں صدی کے سیاسی اور سماجی حالات کا اثر بہت گہرا ہے۔ ان کا زمانہ سیاسی انتشار، معاشی بدحالی اور تہذیبی عدم استحکام کا زمانہ تھا۔ آئے دن کی خانہ جنگیوں نے دارالحکومت دہلی کو آفات کا گھر بنا دیا تھا۔ میر نے نادر شاہ درانی اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کو بھی دیکھا اور سارا عذاب اپنے دل پر سہا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے عروس البلاد دہلی کے گہنے اور آبروئی مرتبہ لوٹی گئی۔ میر نے دہلی کی گلیوں میں خون بہتے، قبروں سے دھواں اٹھتے، بادشاہوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھرتے، شہزادیوں کو خاکِ پاک کی تسبیحات اور کوہِ طور کا سرمہ بیچتے، سرِ پُرغرور کو ٹھوکروں میں پڑے ہوئے اور سب سے بڑھ کر جہان آباد (دہلی) کو خرابہ ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ سب کچھ دیکھتے رہے محسوس کرتے رہے اور سرد و گرمِ زمانہ کو اپنے مزاج میں سموتے رہے۔ اس اعتبار سے ''اُن کو اُردو کا سب سے بڑا الم نگار شاعر قرار دیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔''[3] ان کی شاعری میں دلی اور دِتی کے ایک ہو جانے اور ہم معنی الفاظ بن جانے کا سبب بھی یہی ہے۔ درج ذیل شعر میں دل درحقیقت دِتی شہر کا استعارہ ہے:

ے دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے لفظوں میں:

''میر کا غم، غمِ ذات نہیں غمِ کائنات ہے۔ یہ اپنے دل کی اندرونی فضا میں محدود ایک فرد کی شکست نہیں ہے بلکہ ایک پوری دنیا، ایک پورے عہد کی شکست ہے جس کو ایک فرد نے اپنی ذات میں سمیٹ لیا ہے۔ دنیا کا عظیم آرٹ شکست و فتح، غم و نشاط کی متضاد کیفیتوں کو اس طرح ملا کر دو رنگوں سے ہزار رنگ پیدا کرتا ہے۔ میر کے بعد ایسا نشاطیہ غم کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہُوا۔''[۴]

میر کی عظمت کا سارا دارومدار اس بات میں ہے کہ وہ ایک تہذیبی انسان کے ساتھ ساتھ ایک تہذیبی شاعر بھی تھے۔ انہوں نے عظیم الشان تہذیب کی دیوار کو گرتے ہوئے دیکھا۔ وہ اس دیوار کو آسرا دینا چاہتے تھے مگر ان کے نحیف جسم، کمزور کندھوں اور بوڑھے ہاتھوں میں اتنا دم نہیں تھا کہ وہ اس دیوارِ خستگی کو گرنے سے روک دیتے ہاں مگر وہ یہ کر سکتے تھے کہ اس تہذیب کی اقدار کو اپنی فکر، جذبے، احساس اور متخیلہ میں آمیز کر کے ہمیشگی عطا کر دیں اور انہوں نے یہ کام بہ طریق احسن کیا۔ ان کی شاعری میں جذبے کی لے اور الفاظ کی آہنگ بہت نرم اور دھیما ہے یہ صوتِ زیریں اور تحت اللہجہ کی شاعری ہے اور اس کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا اپنے عہد کے تہذیبی مزاج اور لب و لہجے سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہونا ہے۔ یہی خصوصیت میر کی شاعری میں اعلیٰ انسانی اقدار کی نمود کا سبب بھی ہے۔

میر کے عہد کی تہذیبی روح زخموں سے چور تھی۔ طالع آزماؤں کے ہاتھوں عروس البلاد دہلی کا بار بار اُجڑنا ایسا المیہ تھا جس کا کرب میر کی تخلیقی روح میں سما گیا تھا۔ میر نے اپنے عہد کی تاریخی واقعیت کو شاعرانہ کیفیت میں ڈھال کر پیش کیا۔ اس طرح انہوں نے اپنا تزکیہ ہی نہیں کیا بلکہ غم و نشاط کی امتزاجی صورت کو پیدا کیا۔ میر نے اپنے عہد کے المیہ کو اجتماعی شعور کا حصہ بنا کر غم و نشاط کو زندگی کے لازمہ کے طور پر پیش کیا ہے۔

لکھنؤ جانے تک (۱۷۸۲ء) دہلی کے دگرگوں حالات کی وجہ سے میر خانہ نشین ہو کر رہ گئے تھے مگر وہ حسبِ سابق، مشقِ سخن میں مصروف رہے۔ اس سارے عرصے میں ان کی تخلیقی شخصیت، خارجی انتشار کی داخلی سطح پر شیرازہ بندی کرتی رہی، یہی وجہ تھی کہ ان کی شاعری میں سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تاریخی جبر اس خلّاق سطح پر دکھائی دیتا ہے جہاں وقت، حالات اور زمانہ پیچھے رہ جاتا ہے اور آفاقیت پیدا ہو جاتی ہے۔

دِلّی میں میر کی زندگی اپنے محسنوں، مربیوں اور قدردانوں کے سہارے چلتی رہی لیکن دہلی کی تیزی سے بگڑتی ہوئی اقتصادی صورت حال میں یہ سب سہارے غیر یقینی اور ناپائیدار تھے۔ اسی زمانے میں دِلّی کے تمام نامور شاعر ایک ایک کر کے دہلی چھوڑ گئے اور لکھنؤ میں آباد ہوگئے۔ اس وقت لکھنؤ کے نواب آصف الدولہ کے دربار میں ان کی رسائی بھی

ہوگئی لیکن میر کو نواب آصف الدولہ کا طرزِ عمل ناگوار گزرا اور یہ تعلق بھی عارضی ثابت ہوا۔ اس کے بعد میر نے اپنی زندگی کے باقی سال لکھنؤ ہی میں بسر کیے مگر وہ ہر لحظہ دِلّی کی یاد میں ڈوبے رہے اور اس کے گلی کوچوں کو یاد کرتے کرتے ۱۸۱۰ء میں اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

خرابہ دِلّی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا

وہیں اے کاش مرجاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

میر کے حالاتِ زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی زندگی میں داخلی اور خارجی سطح پر انتشار رہا۔ وہ خارجی انتشار پر تو قابو نہ پاسکے کیونکہ یہ ان کی دسترس سے باہر تھا لیکن انہوں نے جذبے کی تنظیم نو کر کے اپنے داخلی انتشار پر بڑی خوب صورتی سے قابو پا لیا۔ فکر اور جذبے کی تنظیم کا دوسرا نام تخلیق ہے۔ میر کی شاعری جذبے کی تنظیم ہی سے عبارت ہے۔ جذبے کی تنظیم کر کے انہوں نے اپنے احساسات اور جذبات کو تخلیقی اظہار میں منتقل کر دیا جس سے فن کی بلند ترین صورتیں سامنے آئیں اور ان کی زندگی میں داخلی سطح پر استحکام پیدا ہوا۔

میر نے شاعری کو تنظیمِ ذات، تعمیرِ ذات اور دریافتِ ذات کا ذریعہ بنایا۔ انہوں نے شاعری کے تخلیقی عمل کے ذریعے ذات کے منتشر جذبوں کی تنظیم کی اور اس طرح اپنی ذات کی شناخت میں کامیاب ہوئے۔ اسی دریافت کے عمل میں انہوں نے بالواسطہ اپنے عہد کی تہذیب کو بھی دریافت کر لیا۔ یہاں تک ان کے یہاں عشق کا تجربہ بھی تہذیب رسمِ عاشقی کا پاس دار ہے۔

دُور بیٹھا غبارِ میر اُن سے

عشق بن یہ ادب نہیں آتا

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ

کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر کی شاعری عشق کے تہذیبی تصور کو اعلیٰ انسانی قدر کے طور پر پیش کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ میر کے یہاں عشق کے رجحانات نہایت قوی ہیں۔ جب انہوں نے ہوش سنبھالا تو ان کے والد نے انہیں نصیحت کی تھی کہ "بیٹا عشق کرو، عشق ہی اِس کارخانے میں متصرف ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو نظمِ کل قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ بے عشق زندگی وبال ہے، عشق میں جان کی بازی لگا دینا کمال ہے۔ عشق بناتا ہے، عشق ہی کندن کر دیتا ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہے عشق کا ظہور ہے۔"[۵] میر کی آئندہ ساری زندگی، ان کا نظریۂ حیات اور شاعری کا مرکزی نقطہ عشق کا یہی تصور ہے جو انہیں ورثے میں ملا تھا۔ عشق ان کی شاعری کا بنیادی محرک ہے۔ میر کی شاعری کا سوز و ساز، عشق ہی کا مرہونِ منت ہے۔ انہوں نے عشق کی جن ظاہر و پوشیدہ کرامات کا ذکر کیا ہے وہ آگ کو گل و گلزار بنائے بغیر ممکن نہیں۔ آلامِ عشق کے باعث ہی وہ آلامِ زندگی سے نبرد آزما رہے۔ میر کی زندگی بھر یہی وضع رہی اور ان کی شاعری کی وضع بھی یہی ہے۔ وہ نامرادانہ زندگی بسر

کرنے کا طریقہ اور محبت نبھانے کا سلیقہ سکھاتے ہیں۔ میر کی غزل نے تہذیب رسمِ عاشقی کو زندگی کر دیا۔ میر کی غزلیں جذباتی زندگی اور تمدّنِ احوال کی ترجمان ہیں۔ ان غزلوں میں قافیہ پیمائی اور لفظی صنعت گری کی بجائے تخیلی صداقتوں اور اندرونی جذبوں کی ہم آمیزی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ے ایک دل کو ہزار داغ لگا
اندرونے میں جیسے باغ لگا

میر کے اندازِ بیاں کے بارے میں مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ ان کی شاعری میں سادگی انسانی گفتگو کے لہجے سے عبارت ہے۔ تمام اردو شاعری میں شعر کو لہجے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ لہجہ منفرد اندازِ گفتگو یا ان کیفیات سے عبارت ہوتا ہے جو مختلف جذبات اور احساسات کے اظہار سے نمو پاتی ہیں۔ لہجے کی ایک سطح عمومی ہے جہاں شاعر محبت اور شفقت کے کسی جذبے کا اظہار کرتا ہے۔ میر کا تہذیبی لہجہ اسی عمومیت کا حامل ہے۔ دوسرا لہجہ انفرادی لہجہ ہے جس میں شخصی انا اور خود پرستی نمایاں ہوکر بلند آہنگ لہجے میں ڈھل جاتے ہیں۔ اردو شاعری میں سودا، آتش، غالب، یگانہ اور جوش کے لہجے اس کی مثال ہیں۔

میر کا لہجہ دردمندی کا لہجہ ہے۔ ان کے اس لہجے میں محبت اور مروّت کا انداز نمایاں ہے۔ میر نے اپنے درد میں محبت، مروت اور وفا جیسی قدروں کی نایابی کا گلہ کیا تھا، شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا لہجہ احساسِ مروّت اور احترامِ آدمیت کا آئینہ دار ہے۔ یہ لہجہ محبت اور انسانیت کو جلا بخشتا ہے۔ اسی لہجے نے غمِ عشق اور غمِ آفاق سے مل کر میر کے اشعار میں شعلوں کی سی لپٹ پیدا کر دی ہے۔ میر نے اردو زبان کے ارتقاء کی تاریخ میں ایک بڑا کام یہ کیا کہ اپنے عہد کی گفتگو کی زبان کو شاعری میں استعمال کیا۔ یہی نہیں بلکہ زبان کی سند بھی عوام کی زبان سے حاصل کی۔ خواجہ احمد فاروقی نے درست لکھا ہے:

> ''ان کی (میر کی) شاعری کی پشت پر اُردو کے ارتقاء کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ اس میں برس ہا برس کی روایات، تمدنی وراثت، تاریخی اور تہذیبی عوامل کی جلوہ گری ہے۔''[۶]

فنونِ لطیفہ اور بالخصوص شاعری، موسیقی اور مصوّری کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ ان کے اثرات کا تجزیہ نہیں کیا جاسکتا اور شاعری تو کبھی اپنے اسرار پوری طرح افشاء نہیں ہونے دیتی۔ میر کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اس ضمن مین میر کا فرمایا ہوا مستند ہے:

ے کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ ایسی طرز بھی نہیں ایہام بھی نہیں

حوالہ جات

۱۔ آزاد، محمد حسین، ’’آب حیات‘‘، ترتیب و تدوین: ڈاکٹر ابرار عبدالسلام، شعبہء اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، مارچ ۲۰۰۶ء، ص ۱۳۴؛ ’’آبِ حیات‘‘، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن ندارد، ص ۱۷۲

۲۔ شمیم حنفی، ڈاکٹر، ’’تاریخ، تہذیب اور تخلیقی تجربہ‘‘، سنگِ میل پبل کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۶۳

۳۔ اسلم انصاری، ڈاکٹر، ’’اُردو شاعری میں المیہء تصورات‘‘، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور، مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۱۷

۴۔ عبداللہ، سیّد، ڈاکٹر، ’’ولی سے اقبال تک‘‘، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص

۵۔ میر تقی میر، ’’ذکرِ میر (متنِ فارسی)‘‘، ’’میر کی آپ بیتی (اُردو ترجمہ)‘‘، ترتیب و ترجمہ: ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، مجلس ترقی ادب، لاہور، جون ۱۹۹۶ء، ص ۷۸۔۱۷۷

۶۔ احمد فاروقی، خواجہ، ڈاکٹر، ’’میر تقی میر: حیات اور شاعری‘‘، انجمن ترقی اُردو (ہند)، علی گڑھ، جولائی ۱۹۵۴ء، ص ۴۸